اطاعت کا قرآنی تصوّر

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

اطاعت کا قرآنی تصوّر

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک درسِ قرآن سے ماخوذ

مرتب

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور O فون : 3-5869501

نام کتاب ـــــــــــــــ اطاعت کا قرآنی تصور
بارِاوّل (اکتوبر ۱۹۹۵ء) ـــــــــــــــ ۱۱۰۰
باردوم (جون ۱۹۹۸ء) ـــــــــــــــ ۱۱۰۰
بارسوم (جنوری ۲۰۰۳ء) ـــــــــــــــ ۲۲۰۰
ناشر ـــــــــــــــ ناظم نشرواشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
مقامِ اشاعت ـــــــــــــــ ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱
مطبع ـــــــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ـــــــــــــــ ۱۰روپے

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہِ الکریم
اعُوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسمِ اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ○
وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا
الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○ (التغابن : ۱۲)

"اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ پھر اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔

سورۃ التغابن کے مضامین کا تعارف

سورۃ التغابن دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے رکوع میں ۱۰ اور دوسرے رکوع میں ۸ آیات ہیں۔ پھر پہلے رکوع کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا بیان ہے۔ یعنی خبریہ (Narrative) انداز میں توحید، مَعاد اور رسالت جیسے حقائق کس قدر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اگلی تین آیات (۸ تا ۱۰) دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں کہ ان حقائق پر ایمان لاؤ، انہیں مانو، انہیں تسلیم کرو!

دوسرے رکوع کی آٹھ آیات میں سے پہلی پانچ آیات ایمان کے ثمرات و نتائج اور اس کے مضمرات پر مشتمل ہیں۔ حقیقی ایمان اگر دلوں میں جاگزیں اور ذہن و فکر کے اندر پیوست ہو گیا ہو، رچ بس گیا ہو تو اس کے کچھ ثمرات و نتائج نکلنے چاہئیں، جیسا کہ ایک مقولہ ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ چنانچہ قلب کے اندر اگر وہ مخفی حقیقت جس کا نام "ایمان" ہے، موجود ہے تو اس کی پہچان جن ثمرات و نتائج سے ہوتی ہے انہیں ان پانچ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر آخری تین آیات میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بڑی پُرزور دعوت دی گئی ہے۔

آیت زیرِ درس کا محل و مقام

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات جن میں ایمانیات کے مضمرات کو واضح کیا گیا ہے' ان میں سے چار آیات کا تعلق انسان کے فکر و عمل سے ہے۔ یعنی ایمانِ حقیقی حاصل ہونے کے بعد انسان کی سوچ اور اس کے زاویۂ نگاہ میں کیا انقلاب آنا چاہئے اور اس کے باطنی احساسات میں کیا تبدیلی آنی چاہئے۔ جب اس نے اللہ کو مانا ہے تو اسے اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہئے' اسے تسلیم و رضا کی کیفیت کا حامل ہونا چاہئے اور اللہ سے کسی شکوہ و شکایت یا ناراضگی کی کیفیت میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس کا سارا دار و مدار' بھروسہ' توکل اور تکیہ اسباب و وسائل پر نہیں' بلکہ مسبّب الاسباب یعنی ذاتِ باری تعالیٰ پر ہو جانا چاہئے۔ پھر یہ کہ دنیا میں جتنی بھی چیزوں سے اسکا تعلق ہے' خواہ وہ کہ جن سے اس کا سلسلۂ حیات وابستہ ہے' یعنی معاشی اسباب و ذرائع وغیرہ' خواہ وہ علائقِ دنیوی کے زمرے سے ہوں' ان کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر میں واضح تبدیلی آنی چاہئے۔ انسان کو آگاہ رہنا چاہئے کہ جہاں محبت ہو وہیں خطرہ ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی اولاد' والدین' اعزہ و اقارب اور بیویوں (اور بیویوں کو شوہروں) سے جو طبعی محبت ہے یہی درحقیقت خطرے کی علامت ہے۔ یہ محبت اگر ایک حد کے اندر رہے' یعنی اللہ کی محبت کے تابع رہے تو صحیح ہے' درست ہے' لیکن اگر یہ اس حد سے بڑھ جائے تو انسان کی عاقبت برباد ہو جاتی ہے۔ یہ ہے نقطۂ نظر کی وہ تبدیلی جو ایمان کا تقاضا ہے۔ یعنی مال و اسبابِ دنیوی اور اولاد کو ایک فتنہ و آزمائش سمجھنا چاہئے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں آزما رہا ہے۔ چنانچہ ان پانچ آیات میں سے چار آیات انسان کے فکر و نظر کی تبدیلی کے بیان پر مشتمل ہیں' جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے۔ اور یہی وہ آیت ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا مرکز و محور ہے :

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ○

"اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول کی۔ پھر اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں"۔

رسول ﷺ کی ذمہ داری اللہ کے احکام پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ان احکام پر عمل کرنا

سراسر تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور اس کی جوابدہی خود تمہیں کرنی ہوگی۔ جس طرح ایمانی حقائق تو اپنی جگہ اٹل ہیں' کوئی مانے تب بھی اور کوئی نہ مانے تب بھی' لیکن انہیں ماننے میں تمہاری فلاح و کامیابی ہے' اسی طرح اللہ کے احکام تو اپنی جگہ برحق ہیں' واجب التعمیل ہیں' لیکن تمہیں ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر تم ان پر عمل کروگے تو اس میں تمہاری فلاح و نجات اور اللہ کی رضا ہے۔

اطاعت کے مضمرات

نظر آتا ہے' اس لئے کہ ایک لفظ "اطاعت" میں شریعت کے تمام اوامر و نواہی مضمر ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ "اللہ کا حکم مانو" تو اس سے مراد اللہ کے تمام اَحکام ہوتے ہیں' کیونکہ اللہ کا حکم نماز پڑھنے کا بھی ہے' رمضان کے روزے رکھنے کا بھی ہے' صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی ہے' اور صاحبِ استطاعت کے لئے حج کرنے کا بھی ہے۔ پھر یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ اس کے دین کی دعوت دو' دین کی تبلیغ و اشاعت کرو' نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو ا یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام جانو' حلال پر قناعت کرو اور حرام سے اجتناب کرو ا اور یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ دین کے لئے جہاد کرو' کلمۂ حق کہو' عدل و قسط پر قائم رہو' حق کے علمبردار بن جاؤ' انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ---- اور اللہ کے دین کو قائم کرو ا پھر یہ کہ اس کے لئے جان کھپاؤ' مال کھپاؤ' اور اگر ضرورت پڑے تو نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجاؤ ا--- یہ سب احکام ہی تو ہیں' لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ قرآن میں جہاں اللہ کا حکم ماننے کی بات ہوتی ہے ہمارا ذہن

نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں سوچتا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سور نہیں کھانا' شراب نہیں پینی اور زنا نہیں کرنا۔ اس سے آگے اللہ کا کوئی حکم ہمارے سامنے ہے ہی نہیں۔

ہمارے ہاں عمل کا جو سارا فساد پیدا ہوا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ تو ایمان کا فقدان ہے۔ جس چیز کو ایمان سمجھا جاتا ہے وہ محض ایک موروثی عقیدہ (Racial Creed) ہے جو ماں باپ کی طرف سے چلا آ رہا ہے۔ حقیقی ایمان کا حال تو یہ ہے کہ ع "ڈھونڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبا لے کر!" کے مصداق تلاش کرنے پر بھی شاید کہیں نظر آ جائے۔ پھر یہ کہ جہاں ایمان کچھ موجود بھی ہے وہاں فرائض کا تصور محدود ہے اور سارے کا سارا ایمانی جوش و جذبہ انہی "عبادات" کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ جوں جوں ایمانی جذبہ ترقی کرتا ہے تو انسان فرائض کے بعد مستحبات و نوافل میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے --- لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کے احکام تو سب کے سب برابر ہیں' اللہ کا حکم جس طرح زنا اور شراب کی حرمت کا ہے اس سے کہیں بڑھ کر سود کی حرمت کا بھی ہے اور یہ کہ اگر وہ اللہ کے احکام میں کہیں اپنی پسند اور مرضی سے یا اپنی سہولت اور مصلحت کی خاطر ذرا سی بھی تفریق اور تقسیم کر لے تو اس طرزِ عمل کے لئے قرآن میں بہت سخت وعید آئی ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

"کیا تم ہماری کتاب (و شریعت اور ہمارے اوامر نواہی) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟ تو کوئی سزا نہیں ہے اس کی جو تم میں سے یہ روش اختیار کرے سوائے اس کے کہ اسے دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور اللہ غافل نہیں اس سے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو!"

اس اعتبار سے آپ غور کیجئے کہ "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" کہنے کو تو دو چھوٹے چھوٹے جملے ہیں' لیکن ان میں ایک قیامت مضمر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں تِل

کی اوٹ میں پہاڑ موجود ہے۔ شریعت کے تمام اوامر و نواہی اور تمام دینی ذمہ داریوں کا ذکر ان چند الفاظ میں موجود ہے :

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ،

"اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ؐ کی!"

اس کے ساتھ ہی بڑے استغناء کے انداز میں یہ فرمادیا گیا کہ اگر تم نے روگردانی کی' پیٹھ دکھائی' اعراض کیا' انکار کیا تو اس میں اللہ کا کوئی نقصان ہے نہ ان کے رسول ؐ کا :

فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○

"پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول کی ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے!"

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذمہ داری ادا فرمادی' وہ فارغ ہوئے' اب عمل کی ذمہ داری تمام تر تم پر ہے' اور اگر تم اس میں کوتاہی کرو گے تو اللہ کی کوئی احتیاج تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے' اس کا کوئی کام تمہاری اطاعت کے بغیر رکا ہوا نہیں ہے' جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں الفاظ آئے ہیں کہ :

> "اے میرے بندو! اگر تمہارے اولین بھی اور آخرین بھی' انسان بھی اور جن بھی' سب کے سب اتنے متقی ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی بڑے سے بڑا متقی ہو سکتا ہے' تب بھی میری سلطنت اور میرے کارخانۂ قدرت میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا ---- اور اگر تمہارے اولین و آخرین اور انس و جن سب کے سب ایسے ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی زیادہ سے زیادہ سرکش و نافرمان ہو سکتا ہے تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی" ۔ (یہ حدیث حضرت ابوذر غفاری ؓ سے مروی ہے اور صحیح مسلم میں مذکور ہے)۔

معلوم ہوا کہ اللہ تو غنی ہے' اِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ' لیکن اس کے احکامات کی پابندی میں خود ہماری خیر اور بھلائی ہے۔

آیتِ زیرِ درس کے مطالعہ کا آغاز کرنے سے پہلے یہ نسبت و تناسب ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجئے کہ یہاں فکر و نظر کی تبدیلی پر چار آیات اور دعوتِ عمل پر صرف ایک آیت آئی ہے' اس لئے کہ تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام اوامر و نواہی کی پابندی کا دارومدار ہی

فکر و نظر کی تبدیلی پر ہے۔ یہ تبدیلی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے جس قدر زیادہ ہو گی‘ اس کے اندر جس قدر زیادہ پختگی اور دوام ہو گا اور ایمانِ حقیقی جس قدر قلب کی گہرائیوں میں راسخ اور فکر و نظر میں پیوست ہو جائے گا اسی قدر انسان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کر سکے۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم کے درجے میں ہیں۔ اب ہم اس آیتِ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اطاعت کا مفہوم

قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں لفظ "اطاعت" اس سے قبل صرف ایک جگہ یعنی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت لقمانؑ کی نصائح میں جو اضافہ کیا گیا اس میں یہ مضمون آیا ہے کہ اگر مشرک والدین تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو تو ان کی اطاعت مت کرو! وہاں الفاظ آئے ہیں : فَلَا تُطِعْهُمَا کہ پھر تم ان کا کہنا مت مانو‘ یہاں وہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اگرچہ والدین کا مقام اتنا بلند ہے کہ اللہ نے اپنے شکر کے فوراً بعد والدین کے شکر کو لازم قرار دیا (اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ) لیکن اگر وہ اپنے اس مقام سے مزید بلند ہو کر اللہ سے بھی بالاتر ہونا چاہتے ہیں اور اللہ کے احکام کے خلاف کوئی حکم دینا چاہتے ہیں تو ان کا کہنا نہیں مانا جائے گا‘ کیونکہ "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ" یعنی جس معاملے میں اللہ کی معصیت لازم آتی ہو اس معاملے میں مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت نہیں کی جا سکتی!۔۔۔۔ لیکن اصلاً یہ آیتِ مبارکہ (آیتِ زیرِ درس) ہمارے منتخب نصاب میں اطاعت کی تاکید پر مشتمل پہلا مقام ہے۔

لفظ اطاعت اگرچہ عام طور پر کسی بھی حکم برداری‘ فرمانبرداری‘ کسی کے حکم کو مان لینے اور اس کی تعمیل کے لئے استعمال ہو جاتا ہے‘ چاہے وہ برضا و رغبت اور دلی آمادگی سے ہو‘ چاہے بالجبر ہو‘ لیکن دراصل اس لفظ کا مادہ "طوع" ہے جو "کرہ" (مجبوری یا کراہت کے ساتھ کسی کا حکم ماننا) کی ضد ہے۔ چنانچہ یہ لفظ (طوع) قرآن حکیم میں "کرہ" کی ضد کے طور پر تین مقامات پر آیا ہے :

(۱) سورۂ آل عمران کی آیت ۸۳ میں فرمایا :

وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا

کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں وہ سب کی سب اللہ کے حضور میں جھکی ہوئی ہیں' اس کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں' دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور کراہت کے ساتھ بھی!--- کیونکہ ان کے لئے کوئی اور چارۂ کار ہے ہی نہیں۔ خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے وجود کا اکثر و بیشتر حصہ جبراً اللہ کی اطاعت کر رہا ہے' اس لئے کہ ہمارے اس جسمانی وجود کی پوری فزیالوجی اور پورا جسمانی نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم تو اس پر بھی قادر نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کا اگنا بند کر دیں۔ البتہ جہاں اس نے ہمیں اپنا اختیار استعمال کرنے کی کچھ اجازت دی ہے وہاں اگر ہم اپنے اختیار سے اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اسی کے قدموں میں ڈال دیں تو یہی ہماری کامیابی ہے۔

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس اعتبار سے "طوع" اور "کرہ" دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۲) اسی طرح سورۃ الرعد کی آیت ۱۵ جو آیتِ سجدہ ہے' کے الفاظ ہیں :

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا

کہ اللہ کے لئے سجدے میں گری ہوئی ہے ہر شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے' طوعاً بھی اور کرہاً بھی----یعنی بطوعِ خاطر اور بطیبِ خاطر' دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور جبری طور پر بھی۔ کسی کا جی چاہے یا نہ چاہے اسے اس کی اطاعت تو کرنی ہے۔

(۳) سورۂ حم السجدہ (آیت ۱۱) میں "طَوْعًا اَوْ کَرْھًا" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی حرفِ عطف "وَ" کے بجائے "اَوْ" لایا گیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسری کی ضد اور ردِّ مقابل ہیں۔ فرمایا گیا :

فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا

کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ چلے آؤ' طوعاً یا کرہاً' چاہے اپنی مرضی سے' چاہے مجبوری سے۔ یہ احکام ہیں جو ہم نے تمہارے لئے طے کر دیئے ہیں' اب چاہے

اپنی دلی خواہش سے اس پر عمل پیرا ہو چاہے جبراً ان پر عمل کرو' بہرحال یہ تو تمہیں کرنا ہی ہے!

ایمان اور اطاعت کا باہمی تعلق

مذکورہ بالا تین آیات کے بعد ایک آیت سورۃ الاحزاب کی ملاحظہ فرمالیجئے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ میں دین کے عملی تقاضوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

"کسی مؤمن مرد اور کسی مؤمن عورت کے یہ شایانِ شان ہے ہی نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ فرما دیں تو پھر بھی اپنے معاملے میں ان کے پاس کوئی اختیار باقی رہ جائے"۔

یعنی اگر یہ احساس ابھرے بھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد بھی میرے پاس کچھ اختیار اور چوائس موجود ہے تو پھر ایمان کہاں رہا؟ اس سے تو ایمان کی نفی ہو گئی۔ جب اللہ اور اس کے رسول کو مانا ہے تو اپنا اختیار ختم ہو گیا۔ ہاں جب تک کوئی حکم نہ آئے' یا فرض کریں حکم تو موجود ہے لیکن آپ کے علم میں نہیں آیا تو آپ کا اختیار برقرار ہے۔ آپ اللہ کے ہاں اس سے اپنی ناواقفیت کے عذر کو پیش کر سکیں گے اور جن کے ذمہ آپ تک یہ حکم پہنچانا تھا وہ مسئول ٹھہریں گے --- لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ اللہ کا حکم ہے' یہ اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے' یہ سمجھنا کہ اب بھی اس معاملے میں میرا اختیار باقی ہے' ایمان کے منافی طرزِ عمل ہے۔ آیت کا آخری ٹکڑا ہے :

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا (تو وہ جان لے کہ) وہ تو بڑی صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا"۔

اللہ تعالیٰ مجھے' آپ کو اور تمام اہل ایمان کو اس سے بچائے۔

ہر انسان کی انفرادی شخصیت کے دُو رُخ ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ حالات و کیفیات' خواہ

خوش گوار ہوں یا ناگوار' اس پر وارد ہوتی ہیں' اگرچہ یہ اسباب و وسائل کے ایک طویل سلسلے کے ذریعے سے اس تک پہنچیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے تمام اعضاء و جوارح سے کچھ نہ کچھ صادر یا خارج ہوتا ہے۔ ہم زبان سے بات کرتے ہیں تو اس کے لئے ہمارے دماغ کا ایک بڑا حصہ' عضلات کا ایک پورا سلسلہ اور ہماری زبان اور ہونٹ کام کرتے ہیں' تب کہیں جا کر الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پر جو کچھ وارد ہو' خواہ وہ کسی بھی سلسلۂ اَسباب سے ہو کر آ رہا ہو' سمجھا جائے کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ درمیان میں عمل کرنے والا ذمہ دار نہیں رہا' وہ اگر ظلم کر رہا ہے تو اسے اس کے ظلم کی سزا دی جائے گی' البتہ ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ بغیر اذنِ رب ہم پر کوئی شے وارد نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسری طرف جو کچھ ہم سے صادر ہو رہا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل کر صادر ہونا چاہئے۔ اس کے لئے مجھے فانی کا یہ اندازِ تعبیر بہت پسند ہے۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اس شعر میں جبریہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے' اگرچہ ہم اس موقف کو صد فیصد درست نہیں سمجھتے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایک قدرت بھی رکھی ہے اور اسے اختیار بھی دیا ہے کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا... لیکن ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ ایک پورے فلسفیانہ مکتب فکر کا نظریہ ہے' جسے فانی نے اپنے شعر میں بیان کر دیا ہے' لیکن بہرحال ان کے نزدیک انسانی اعمال کا معاملہ یہ ہے کہ۔

سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں!

اسی کو غنیمت سمجھو کہ تمہیں تمہارے خالق نے اختیار کا ایک احساس تو دیا ہے اور تم یہ محسوس کرتے ہو کہ میں یہ اپنی مرضی سے کر رہا ہوں---- فانی کے اس اندازِ تعبیر کو اختیار

کرتے ہوئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے اعمال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہونا چاہئے۔ ہمارا ہر عمل خواہ وہ آنکھ سے ہو رہا ہو' ہاتھ سے ہو رہا ہو یا زبان سے ہو رہا ہو' اس کے بارے میں ہمیں محتاط رہنا چاہئے کہ وہ اطاعت کے اس سانچے سے باہر نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اعمال غیر اختیاری طور پر بھی صادر ہو جاتے ہیں' مثلاً راہ چلتے کوئی ایسی آواز آپ کے کانوں میں پڑ گئی جس کا بالارادہ سننا گناہ ہے' یا اچانک کسی نامحرم پر نگاہ پڑ گئی' لیکن یہی اعمال اگر اپنے ارادہ و اختیار سے کئے جائیں تو ان کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی آپ کے اختیار کا سانچہ موجود ہے اس میں سے برآمد ہونے والا ہر عمل گویا اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہئے۔

ارادہ و عمل کے اختیار کے بارے میں ایک متوازن نقطہ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں جو اختیار حاصل ہے وہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے جتنا عام آدمی سمجھتا ہے' بلکہ ہماری مجبوری کا پہلو بھی یقیناً بہت بڑا ہے۔ مثلاً ہمارا Genetics کا نظام ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں جو جینز (Genes) ملے ہیں جن سے ہمارے جسمانی نقش و نگار اور ہماری شخصیت کے خد و خال تیار ہوئے ہیں وہ ہمارے خالق کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور ہمیں اس معاملہ میں کسی انتخاب و اختیار کا حق نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اعتبارات سے ہم مجبور ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی شخصیت میں اختیار کا ایک عنصر بہرحال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ عنصر جس مقدار میں رکھا ہے اسی نسبت سے وہ اس کا محاسبہ کرے گا۔ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے جو بھی اختیار دیا ہے اسے اپنے اختیار سے اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔

اب ظاہر بات ہے کہ اطاعت پر ہی ایمانِ حقیقی کا دار و مدار ہے۔ اگر اطاعت موجود ہے تو ایمان موجود ہے' اور اگر اطاعت نہیں ہے تو ایمان بھی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہاں بات حقیقی ایمان کی ہو رہی ہے نہ کہ قانونی ایمان کی جس کی بناء پر ہم کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہماری ایک سماجی ضرورت اور مجبوری ہے کہ ہم دنیا میں کسی شخص

کو قانونی طور پر مسلمان قرار دینے کے لئے ان ظاہری علامات ہی کا اعتبار کریں گے جو شریعت نے معین کی ہیں۔ کوئی شخص اللہ کی توحید اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتا ہو اور دیگر ارکانِ اسلام کی پابندی کرتا ہو یا کم از کم ان میں سے کسی کا منکر نہ ہو تو اسے قانوناً مسلمان سمجھا جائے گا' اس لئے کہ ہم کسی کے دل میں جھانک کر دیکھنے پر تو قادر نہیں ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ایمان کے ان دونوں درجوں کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک طرف یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ ایمان اور اطاعت لازم و ملزوم ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کے بغیر ایمان کی نفی فرمائی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ روایت میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں :

لَا یَزْنِی الزَّانِی حِینَ یَزْنِی وَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِینَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِینَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ...

یعنی کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شراب پینے والا حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت ایسے شخص کا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح کی احادیث میں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے۔ دوسری طرف اہل سنت کا متفق علیہ موقف یہ ہے کہ ہر فاسق و فاجر کلمہ گو کو بھی قانونی طور پر مسلمان سمجھا جائے گا اور اس کے گناہگار ہونے کی بنا پر اس کے ایمان (قانونی) کی نفی نہیں کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے "الفقہ الاکبر" میں' جو فقہ کے میدان میں ان کا اصل کارنامہ ہے اور جس میں ریاست اور قانون سے متعلق بنیادی معاملات و مسائل کو طے کیا گیا ہے' یہ اصول بیان کیا ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب بھی کافر نہیں ہے' اس کے قانونی ایمان کی نفی نہیں کی جائے گی۔ ان کا یہ اصول صد فی صد درست ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا' حقیقی ایمان کے لئے اطاعت ناگزیر ہے۔ ایک حدیث کے مطابق' جسے امام نوویؒ نے صحیح قرار دیا ہے' رسول اللہ ﷺ نے اصولی طور پر یہ طے فرما دیا ہے کہ

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں"۔

یعنی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہشِ نفس میں انقیاد پیدا ہو جائے' خواہشِ نفس دین کے تابع ہو جائے اور اپنے آپ کو اطاعت کے سانچے میں ڈھال دے۔ کھانے کی طلب پیٹ کی طبعی خواہش ہے' لیکن یہ وہی کچھ مانگے جو حلال ہے۔ اسی طرح جنسی تسکین ایک جبلّی خواہش ہے' لیکن اسے صرف اس جائز راستے سے پورا کیا جا رہا ہو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے معین کر دیا گیا ہے۔ غرضیکہ جس کسی کو جو کچھ بھی دیا جائے وہ محض طبعی تقاضے یا طبعی محبت کے طور پر نہیں' بلکہ اللہ اور رسولؐ کا معیّن کردہ حق سمجھ کر دیا جائے۔ اپنے نفس کو بھی محض اس کے طبعی تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ نہ دیا جائے بلکہ اللہ کا معیّن کردہ حق سمجھ کر دیا جائے' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْرِکَ عَلَیْکَ حَقًّا" یعنی "تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے"۔۔۔ چنانچہ والدین' بھائی بہنوں اور بیوی بچوں میں سے جس کسی کو بھی کچھ دیا جائے وہ اس کا حق سمجھ کر دیا جائے اور وہی کچھ دیا جائے جو اللہ نے معیّن کر دیا ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ کا ارشادِ گرامی روایت کرتے ہیں:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ (رواہ ابوداؤد)

"جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' کسی سے بغض رکھا تو اللہ کے لئے رکھا' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو اللہ کے لئے روکا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا"۔

ایمان اور عمل صالح کا جس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اس کی صراحت ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی

ہیں ورنہ اس مضمون کی احادیث کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اسی بات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ایک آیت ملاحظہ کیجئے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (آل عمران : ۹۷)

"اللہ کا حق ہے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا جو کوئی بھی اس کی طرف سفر کی مقدرت رکھتا ہو۔ اور جو کفر کرے تو اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے"۔

یعنی جو مقدرت کے باوجود حج نہ کرے وہ اصل حقیقت کے اعتبار سے گویا کہ کفر کر رہا ہے۔ اسی طرح یہ مشہور حدیث آپ نے یقیناً سنی ہوگی :

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ

"جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا"۔

نماز اللہ کی طرف سے عائد کردہ ایک فریضہ ہے' جو کوئی اس کو چھوڑ رہا ہے وہ در حقیقت کفر کر رہا ہے' اگرچہ قانونی طور پر اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی کفر اور قانونی کفر میں بھی فرق ہے جس طرح حقیقی ایمان اور قانونی ایمان میں فرق ہے۔ ان چاروں چیزوں کو گڈمڈ کر دینے سے بہت سے فسادات پیدا ہو جاتے ہیں اور بہت سے فتنے کھڑے ہو جاتے ہیں' جیسا کہ خوارج اور معتزلہ جیسے فتنے اسی وجہ سے پیدا ہوئے۔

اب اس "اطاعت" کے ضمن میں چند بنیادی باتیں مزید نوٹ کر لیجئے :

۱۔ <u>اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت</u> : اطاعت اصلاً اللہ کی اور عملاً رسولؐ کی ہے۔ رسولؐ کی اطاعت در حقیقت اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہے' نہ کہ ان کی ذاتی

حیثیت سے۔ اس معاملے میں بھی بڑے فرق و امتیاز کی ضرورت ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت ابھی ہمارے سامنے آجائے گی۔ سورۃ النساء کی آیت ۶۴ میں فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

"اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے"۔

یعنی کسی رسولؑ کی اطاعت اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہے' بلکہ اس کی اطاعت اللہ کے رسول کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ رسول' اللہ کا نمائندہ ہے جو انسانوں تک اللہ کا حکم پہنچاتا ہے۔ چونکہ انسانوں تک اللہ کا حکم براہ راست نازل نہیں ہوتا' لہٰذا "اَطِيْعُوا اللّٰهَ" پر عمل "اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اطاعت اصل میں اللہ ہی کی ہے اور رسول کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے' جیسا کہ فرمایا گیا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء : ۸۰)

"جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی"۔

اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام میں سے ایک ایک رسول کا تذکرہ آیا ہے اور ہر رسول کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۝ "پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو"۔ وہاں اللہ کے ساتھ لفظ اطاعت نہیں آیا' کیونکہ رسول کی اطاعت بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی اطاعت ہے۔ چنانچہ وہاں پر اطاعت کو رسول کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے اور اللہ کے ساتھ صرف لفظ "تقویٰ" لایا گیا ہے۔

رسول ﷺ کی یہ اطاعت کس درجے مطلوب ہے اور ایمان حقیقی کے اعتبار سے اس کا معیار کیا ہے' اس کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ ملاحظہ کیجئے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝

"تو (اے محمد ﷺ) آپ کے رب کی قسم یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک

کہ یہ ان تمام معاملات میں جو ان کے مابین اٹھ کھڑے ہوں آپؐ کو حکم تسلیم نہ کریں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس کے بارے میں دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے خوشی سے قبول کریں۔"

رسول ﷺ کے حکم کو رد کر دینا اور آپؐ اس کی نافرمانی کرنا تو بہت دور کی بات ہے' جو کھلم کھلا بغاوت ہے--- لیکن طرزِ عمل اگر یہ ہو کہ رسولؐ کا حکم مان بھی لیا اور اس پر عمل بھی کر لیا لیکن طبیعت میں کسی انقباض' ناگواری اور تنگی کا احساس ہوا تو یہ کیفیت بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت پیاری اور بڑی جامع حدیث صحیح بخاری میں آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى"

"میری امت پوری کی پوری جنت میں جائے گی' سوائے اس کے جو خود انکار کر دے"

قِيلَ: وَمَنْ أَبَى؟

پوچھا گیا (اے اللہ کے رسول ﷺ) ایسا کون ہے جو (جنت میں جانے سے) انکار کرے؟

قَالَ: "مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى"

فرمایا: "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا (جنت میں جانے سے) خود انکار کر دیا۔"

تو معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کا دروازہ رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔

۲ - حدیثِ رسولؐ کا مقام: رسول ﷺ کے حکم کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ رسولؐ کا حکم وحیِ جلی پر مبنی بھی ہو سکتا ہے اور وحیِ خفی پر بھی۔ وحیِ جلی قرآن ہے' جسے وحیِ متلو بھی کہا جاتا ہے یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور وحیِ خفی حدیثِ رسولؐ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ رسولؐ کا حکم صرف وہی شمار نہیں کیا جائے گا جو قرآن میں ہو' بلکہ رسولؐ ایسا حکم بھی دے سکتے ہیں جو وحیِ خفی پر مبنی ہو۔ یہ نکتہ اہلِ سنت اور منکرینِ سنت کے مابین حدِ فاصل ہے۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ

وحی جلی کی طرح وحی خفی کو ماننا بھی ضروری ہے اور رسول ﷺ کی اطاعت بھی بجائے خود مستقل اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں رسول ﷺ کے لئے لفظ "اَطِیْعُوا" کی تکرار وارد ہوئی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے والیانِ امر کا"۔

یہاں اللہ کے بعد رسول ﷺ کے ساتھ بھی "اَطِیْعُوا" کے لفظ کو دہرایا گیا ہے، لیکن اُولِی الْاَمْر کے لئے لفظ "اَطِیْعُوا" نہیں دہرایا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی اطاعت بھی اپنی جگہ مستقل بِالذات اطاعت ہے اور ان کی ذمہ داری صرف اللہ کے حکم کو پہنچا دینا ہی نہیں ہے۔

انکارِ حدیث اِس دور کا خاصا بڑا فتنہ ہے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ اس کا جلد شکار ہو جاتے ہیں، کیونکہ مغربی افکار کے زیر اثر اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے باعث ان کے ذہن پہلے سے اس کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ احادیثِ رسول ﷺ کے بارے میں ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ یہ ہم پر کچھ زیادہ ہی قدغنیں عائد کرنے والی چیزیں ہیں۔ چنانچہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں احادیثِ رسول ﷺ سے اِباء کا ایک جذبہ عام طور پر پہلے سے موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ "گوشِ حقیقت نیوش" سے منکرینِ حدیث کی باتوں کو سنتے ہیں اور اس سے فوری اثر قبول کرتے ہیں۔ اِس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ملاحظہ کیجئے، جو ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی میں روایت ہوئی ہے:

عن مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلَا اِنِّی اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ، اَلَا یُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْكَتِهٖ یَقُوْلُ عَلَیْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ، وَاِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ

حضرت مقدام بن معد یکرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لوگو آگاہ ہو جاؤ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کی مانند ایک اور شے بھی اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے چھپر کھٹ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور لوگوں سے کہہ رہا ہو کہ دیکھو لوگو، تم پر بس اس قرآن کی پابندی لازم ہے، جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو۔ جان لو کہ جس طرح اللہ نے کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں اسی طرح اللہ کے رسول نے بھی کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں"۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ "اِنّی اُوتیتُ القُرآنَ وَمِثلَہُ مَعَہ"... یہ الفاظ اس حقیقت پر نصِ قطعی کا درجہ رکھتے ہیں کہ وحیِ جلی (قرآن) کے علاوہ محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک وحی خفی بھی عطا ہوئی ہے اور وہ اپنی قطعیت کے اعتبار سے قرآن کے مثل ہے۔ اسی طرح "اِنّما حرّم رَسُولُ اللّٰہ کَمَا حرّم اللّٰہ" کے الفاظ سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ احکامِ شریعت کا اپنی جگہ پر ایک مستقل ذریعہ اور مستقل شعبہ ہے۔ اس اعتبار سے رسولؐ کی اطاعت، خواہ وہ وحی جلی پر مبنی ہو یا وحیِ خفی پر، بہر حال لازم ہے اور اس ضمن میں ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح مسند احمد، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور بیہقی میں حضرت ابو رافعؓ سے روایت ہے:

> لا اُلفِینَّ احدَکم علیٰ اریکتِہ یأتیہ الامرُ من امری مما امرتُ بہ او نہیتُ عنہ، فیقول: لا ادری، ما وجدنا فی کتابِ اللّٰہ اتّبعناہ۔
>
> "ایسا نہ ہو کہ میں پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی کسی آرام دہ نشست پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کو میرا کوئی حکم پہنچے جو میں نے کوئی کام کرنے کو کہا ہو یا کسی شے سے روکا ہو تو وہ کہے: میں نہیں جانتا، ہم تو بس اسی شے کی پیروی کریں گے جو کتاب اللہ میں ہے"۔

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو خبردار کیا ہے جو بڑے مرفہ الحال اور بڑے خوشحال ہوں گے، بڑے اچھے حالات میں بیٹھے ہوئے ہوں گے اور وحی جلی اور وحیِ

خفی کے مابین تفریق کرکے حدیثِ رسول ؐ کا استخفاف کریں گے۔ یہ طرزِ عمل بوریا نشینوں کا نہیں ہوگا بلکہ اونچی سطح کے لوگ ہی اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔

۳ - رسول ؐ کے حکم اور رائے میں فرق: اس ضمن میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ رسول ؐ کے بھی حکم، مشورہ اور رائے میں فرق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت مشکل مسئلہ ہے کہ اس فرق کا تعین کس طرح کیا جائے۔ یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشکل نہیں تھا، لیکن آپ ؐ کے بعد اس اشکال کے حل کے لئے امت کے بہترین دماغوں نے سوچ بچار کی ہے۔ صحابہ کرام ؓ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ آپ ؐ سے دریافت کر لیتے تھے کہ حضور یہ آپ ؐ کا حکم ہے یا مشورہ؟ یہ بات جو آپ فرما رہے ہیں آیا یہ اللہ کا حکم ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے یا یہ آپ ؐ کی ذاتی رائے ہے؟ آیا ہمیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ چنانچہ غزوہ بدر کے موقع پر بعض صحابہ کرام ؓ نے آپ سے عرض کیا کہ اس جگہ جو آپ ؐ نے فوجی پڑاؤ لگایا ہے اگر تو یہ ازروئے وحی ہے تو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا لیکن اگر یہ آپ ؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکیں۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس اشکال کے حل کے لئے فقہائے کرام کو بہت محنت کرنا پڑی ہے۔

یہاں ہم حضور ؐ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ کو اصولی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حدیث "تابیرِ نخل" بہت مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ ؐ نے دیکھا کہ اہل مدینہ کھجور کے ضمن میں مصنوعی زرپاشی (Artificial Pollination) کا اہتمام کرتے تھے، یعنی نر کھجور کے گابھے کو مونث کھجور کے گابھے کے نزدیک لے آیا جاتا تاکہ زرپاشی کا عمل زیادہ ہو اور اس طرح زیادہ پھل حاصل کیا جا سکے۔ یہ چیز ان کے تجربے میں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ عمل کرتے دیکھا تو فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرتے تو شاید بہتر ہوتا۔ یعنی قدرت نے جو نظام بنا رکھا ہے اس میں خواہ مخواہ کی دخل اندازی کیوں کی جائے۔ اس پر صحابہ کرام ؓ نے اُس سال مصنوعی افزائشِ نسل کا یہ عمل نہیں کیا، لیکن اس کے نتیجے میں فصل کم ہو گئی۔ چنانچہ صحابہ کرام ؓ آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور ؐ ہم اپنے تجربے

کی بناپر یہ عمل کیا کرتے تھے مگر اس بار آپؐ کے فرمانے سے ہم نے ایسا نہیں کیا، لیکن اس سے فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ

"بلاشبہ میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اسے مضبوطی سے تھامو اور اگر تم سے میں کوئی بات اپنی رائے کی بناء پر کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں"۔

یہ صحیح مسلم کی حدیث ہے جو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے دینی معاملات اور سائنسی ترقی سے متعلق معاملات کی نوعیت میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نبیؐ سائنس پڑھانے آئے تھے نہ زراعت کے طور طریقے سکھانے، بلکہ ان کا اصل موضوع انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانوں کی نظری اور عملی ہدایت تھا۔ چنانچہ جو چیز آپؐ کی طرف سے اس ضمن میں دی جائے اس کو لے لینا اور مضبوطی سے تھامنا لازم ہے، لیکن جن معاملات کا تعلق امورِ دینیہ سے نہیں بلکہ امورِ طبعیہ سے ہے ان کے ضمن میں نبیؐ اگر اپنی ذاتی رائے پیش کریں تو اس کا تسلیم کرنا بھی واجب نہیں، کجا یہ کہ اس پر عمل کرنا واجب ہو۔ مثلاً یہ کہ بارش کیسے ہوتی ہے؟ زلزلے کیسے آتے ہیں؟ دن اور رات کیسے نکلتے ہیں؟ سورج اور چاند کا کیا نظام ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ان چیزوں کا تعلق امورِ تکوینیہ اور امورِ طبعیہ سے ہے، نہ کہ امورِ دینیہ اور امورِ تشریعیہ سے۔ ایسے امور کی جو توجیہہ بھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں فرمائی وہ اُس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھی اور اُس وقت اس سے زیادہ کوئی بات بتانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ انسانی ذہن ابھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا کہ ان حقائق کا ادراک کر سکتا۔ اس کے لئے تو اگر پہلے فزکس، کیمسٹری، جیالوجی اور اسٹرانومی جیسے علوم پڑھائے جاتے تب کہیں جا کر وہ چیزیں لوگوں کے ذہن کی گرفت میں آتیں جو سائنسی ترقی کی وجہ سے آج ہمارے علم میں ہیں۔۔۔ اور اللہ کے رسولؐ اس کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے اُس دور کی علمی سطح کے مطابق لوگوں کو سمجھانے کے لئے ان معاملات سے

متعلق ہو کچھ فرمایا' ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہی تعبیرات ہم بھی اختیار کریں۔ البتہ جہاں تک احکام کا تعلق ہے کہ یہ کرو یہ نہ کرو' یہ حلال ہے یہ حرام ہے' یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے' یہ واجب ہے یہ فرض ہے' تو اس قسم میں حضورؐ کا ہر فرمان ہمارے لئے واجب التعمیل ہے ---- اِلّا یہ کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ حضورؐ کی ذاتی رائے یا مشورہ تھا' مستقل حکم نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرام اور صحابیات (رضوان اللّٰہ علیہم وعلیہن اجمعین) کو جو تربیت دی تھی اس میں کس درجے گہرائی تھی اور ان میں سے نہ صرف وہ جو چوٹی کے لوگ تھے بلکہ نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والے صحابہؓ و صحابیاتؓ میں بھی کتنا گہرا فہم و شعور پیدا ہو چکا تھا۔ یہ بات حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے معاملے میں واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کنیز تھیں اور حضرت مغیثؓ بھی ایک غلام تھے۔ دونوں کے آقاؤں کی اجازت سے ان دونوں کے مابین نکاح کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ نے آزاد کر دیا تو ان کی معاشرتی حیثیت حضرت مغیثؓ سے برتر ہو گئی۔ آزاد ہونے کے بعد عورت کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اس نکاح کو جو اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ کنیز تھی' چاہے تو برقرار رکھے اور چاہے تو اس سے آزادی حاصل کر لے۔ حضرت بریرہؓ نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے حضرت مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت مغیثؓ کو ان سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے پہلے تو براہ راست بریرہؓ کی خوشامد کی کہ وہ یہ تعلق نہ توڑیں' لیکن جب بات نہ بنی تو حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر فریاد کی۔ حضورؐ نے حضرت بریرہ کو بلا کر فرمایا کہ اے بریرہ کیا حرج ہے اگر تم مغیث ہی کے گھر میں رہو؟ اس پر حضرت بریرہؓ نے فوراً جو سوال کیا وہ یہ تھا کہ حضورؐ یہ آپؐ کا حکم ہے یا مشورہ؟ اور جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرا حکم نہیں بلکہ مشورہ ہے تو بریرہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ میں اس مشورے پر عمل نہیں کر سکتی! تو یہ ہے وہ باریک اور نازک سا فرق جو رسول اللہ ﷺ کے حکم اور آپؐ کے مشورے کے مابین حضرت بریرہؓ نے روا رکھا جو ایک ادنیٰ کنیز تھیں۔ اور

اگر یہ واقعہ احادیث میں نہ آیا ہوتا تو شاید ہم میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا ہوتا کہ حضرت عائشہؓ کی کوئی بریرہؓ نامی کنیز بھی تھی۔ لیکن یہ واقعہ ایسا ہے اور اس میں مسلمانوں کے لئے ایسی ابدی رہنمائی ہے کہ اب اس کے حوالے سے حضرت بریرہؓ کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

تو اطاعت کے ضمن میں میں نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ اطاعت اصلاً اللہ کی ہے لیکن عملاً رسولؐ کی ہے۔ پھر یہ کہ اللہ کے رسول کی یہ اطاعت ہر حکم میں واجب ہے، وہ حکم وحی جلی پر مبنی بھی ہو سکتا ہے اور وحی خفی پر بھی۔ البتہ رسولؐ کے حکم اور ان کے مشورے اور رائے میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔

"اولی الامر" کی اطاعت

حکم ہوا اطاعت کے ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد "اولی الامر" کی اطاعت کا معاملہ آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں فرمایا گیا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

"اے ایمان والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور والیانِ امر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر باہم جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسولؐ کی طرف اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔"

یہ آیتِ مبارکہ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں شمار ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر جو دستوری اور قانونی نظام قائم کیا جائے گا اس کے لئے راہنمائی کا یہ گویا سب سے بڑا مخزن اور منبع و سرچشمہ ہے۔ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کے بارے میں تو ہم گفتگو کر چکے ہیں، یہاں اب اولی الامر کی اطاعت کے معاملے کو تھوڑا سا تجزیہ کر کے سمجھ لیا جائے۔

اطاعت کی دو لازمی شرائط

۱۔ سب سے پہلی بات یہ کہ یہاں "اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کے الفاظ آئے ہیں یعنی اولی الامر جو خود تم (مسلمانوں) میں سے ہوں۔ حاکم اور والیٔ امر اگر غیر مسلم ہو تو وہ ان الفاظ کا مصداق نہیں ہو گا اور ایسے حاکم کی اطاعت اگر طوعِ خاطر سے کی جائے گی تو اُس سے اسلام کی نفی ہو جائے گی۔ غیر مسلم حاکم کی اطاعت مجبوراً تو کی جا سکتی ہے' برضا و رغبت نہیں امثال کے طور پر اگر کسی غیر مسلم حکمران نے مسلمانوں کا کوئی علاقہ بزورِ شمشیر فتح کر لیا ہو یا کسی نے کسی مسلمان کو جبراً گرفتار کر کے غلام بنا لیا ہو' جیسے افریقہ سے ہزاروں مسلمانوں کو جبری طور پر غلام بنا کر لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر امریکہ لے جایا گیا' تو ایسی صورت میں ایک مسلمان اپنے غیر مسلم آقا کی اطاعت پر مجبور ہے ...... لیکن درحقیقت اصل اطاعت جو طوعِ خاطر سے کی جائے اس کے لئے "مِنْکُمْ" شرط لازم ہے۔

۲۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مستقل بالذات ہے' لیکن اولی الامر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے تابع اور اس سے مشروط ہے۔ یہ اطاعت کبھی بھی غیر مشروط نہیں ہو سکتی' بلکہ ہمیشہ سے مشروط رہی ہے اور ہمیشہ مشروط ہی رہے گی۔

"اولی الامر" کون ہیں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اولی الامر کون ہیں؟ ہم اس کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ اولی الامر معاشرتی نظام میں بھی ہیں اور سیاسی نظام میں بھی۔ چنانچہ گھر کا سربراہ اپنے گھر کے لئے والیٔ امر ہے۔ اسی طرح معاشرتی نظام میں ہر جگہ درجہ بدرجہ ہر شخص کی جو بھی حیثیت ہے اس کے اعتبار سے وہ اپنے دائرے کے اندر صاحبِ امر ہے۔ لہٰذا اطاعت کا سلسلہ صرف حاکمِ اعلیٰ تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے۔ بیوی کے لئے شوہر والیٔ امر ہے' جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: "فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ" کہ نیک بیویاں وہی ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں۔ بیوی کے لئے شوہر کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہے' الا یہ کہ وہ اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کی اطاعت سے متصادم ہو: "لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃِ الخالق"۔

مزید برآں، ماتحت امراء کا شمار بھی اولی الامر میں ہوتا ہے۔ ایسے امراء رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ہوتے تھے، جیسے کہیں کوئی لشکر بھیجا جاتا تو ان کا کسی کو سپہ سالار مقرر کیا جاتا، کہیں کوئی چھوٹا سا دستہ بھی بھیجا جاتا تو اس میں بھی کسی کو امیر بنایا جاتا۔ اس ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعات آپ کے سامنے آ جائیں۔ غزوۂ احد میں ۳۵ حضرات کی طرف سے اپنے امیر حضرت جُبیرؓ بن مطعمؓ کی حکم عدولی کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیراندازوں کا امیر مقرر کر کے ایک درے پر متعین کیا تھا اور ان حضرات کو حکم دیا تھا کہ آپ لوگ اس درے کو مت چھوڑیں خواہ ہمیں شکست ہو جائے، ہم سب قتل ہو جائیں اور آپ لوگ دیکھیں کہ پرندے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ ان حضرات نے جب اپنے لشکر کو فتح سے ہمکنار ہوتے اور دشمن کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا تو درے کو چھوڑ کر جانے لگے، کیونکہ ان کے خیال میں حضورؐ نے درے کو نہ چھوڑنے کا جو حکم دیا تھا وہ شکست کی صورت میں تھا۔ لوکل کمانڈر حضرت جُبیرؓ بن مطعمؓ انہیں روکتے رہے، لیکن ان ۵۰ میں سے ۳۵ صحابہ کرامؓ درے کو چھوڑ گئے۔ ماتحت امیر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوری طور پر یہ دی گئی کہ جیتی ہوئی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا گیا۔ سورۂ آلِ عمران میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ

یعنی اللہ نے تو تمہیں اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑے، تم نے نظم کو توڑا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ میں تم کو وہ چیز دکھا چکا جو تمہیں بہت محبوب ہے، یعنی فتح!۔۔۔ یہاں نافرمانی سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں، بلکہ ماتحت کمانڈر کی نافرمانی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ

کے حکم کی تو انھوں نے تاویل کر لی تھی۔

اسی طرح کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کا ایک دستہ کہیں بھیجا اور ان میں سے ایک صاحب کو اس کا امیر مقرر کیا۔ یہ صاحب ذرا جلالی مزاج کے مالک تھے' کسی بات پر اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے اور یہ ناراضگی اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ایک بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ جب انھوں نے گڑھا کھود دیا تو ان سے فرمایا کہ اس کے اندر لکڑیاں جمع کرو۔ لکڑیاں جمع کر دی گئیں تو انہیں آگ لگانے کا حکم دیا۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو ساتھیوں سے فرمایا کہ اب اس آگ میں کود جاؤ۔ اس پر ساتھیوں نے کہا کہ اس آگ سے [illegible] کے لئے تو ہم نے محمد ﷺ [illegible] ہم اس میں داخل ہونے کو تو تیار نہیں ہیں۔ جب داخل [illegible] کے سامنے پیش کیا گیا تو حضورؐ نے ان کی تصویب کی اور فرمایا کہ اگر [illegible] آگ میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ اس لئے [illegible] فی النار ہے۔ چنانچہ اطاعت امراء کی اطاعت رسول اللہ [illegible] رسول کے حکم کے تابع تھی' اس دائرے سے خارج [illegible] اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط رہے گی۔

فقہائے کرامؒ کا عظیم کارنامہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ معاملہ اس اعتبار سے بہت کٹھن بن گیا ہے کہ اب قرآن بھی ہمارے سامنے صرف ایک متن کی صورت میں موجود ہے' اللہ ہمارے سامنے بنفس نفیس نہیں ہے' وہ نہ ہمیں براہ راست حکم دے رہا ہے اور نہ براہ راست اپنے حکم کی تاویل و توضیح کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں اللہ کے احکام کی تاویل بھی فرماتے اور اس کی توضیح بھی فرماتے' جو ہر لحاظ سے مستند ہوتی۔ انھیں اس کا اختیار حاصل تھا۔ اسی طرح حضورؐ خود اپنے حکم کے بارے میں بھی وضاحت فرما دیتے تھے کہ میری اس بات کی حیثیت واجب التعمیل حکم کی ہے اور میری یہ بات صرف مشورے کے درجے میں ہے۔ چنانچہ معاملہ بہت سادہ تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ تعیین کرنا اتنا آسان نہیں رہا کہ

قرآن حکیم کے اوامر میں سے کونسے واقعتاً واجب التعمیل ہیں اور کونسے صرف مستحب کے درجے میں ہیں' مثلاً سورۃ الجمعہ میں جو یہ فرمایا گیا کہ جب جمعہ کی نماز ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ (فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ) تو کیا یہ وجوب کے لئے ہے؟ عام اصول تو یہی ہے کہ "الامر للوجوب" لیکن جمعہ کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جانا اور کاروبارِ دنیا میں مصروف ہو جانا لازم تو نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن حکیم کے بعض اوامر ایسے ہیں جو لازم نہیں ہیں' بلکہ ان سے استحباب یا اجازت کا مفہوم نکلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اقوال کے ضمن میں یہ معاملہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر حدیث کے بارے میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ آپ کا فرمان ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی سند کیا ہے؟ سند قوی ہے یا ضعیف؟ پھر یہ کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ آیا یہ آپ کا حکم تھا' مشورہ تھا' ذاتی رائے تھی یا اجتہاد تھا؟ اصل میں یہی وہ دقت تھی جس کے حل کے لئے حضور کے انتقال کے بعد سو دو سو برس تک امت کے بہترین دماغ انہی چیزوں پر سوچ بچار کرتے رہے۔ وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہاء کی ایک کونسل بنائی۔ ان کا یہ عمل (معاذ اللہ) کوئی مشغلے کے طور پر نہ تھا۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ محض شغل کے طور پر ان کاموں میں لگے رہتے۔ انہیں اس ضرورت کا شدید احساس تھا کہ احکامِ شریعت کی درجہ بندی کی جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کونسی شے فرض ہے' کونسی واجب' کونسی سنتِ مؤکدہ ہے اور کونسی مستحب کے درجے میں ہے۔ پھر ان احکام کے تعین کے لئے اصول وضوابط معین کئے گئے۔ اصولِ فقہ' اصولِ تفسیر اور اصولِ حدیث مقرر ہوئے۔ مختلف فقہی مسالک کے مابین جو اختلافات سامنے آئے وہ ایک فطری بات ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں انسانی ذہن کام کرتا ہے وہاں اختلاف کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ تو اس اعتبار سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ اصل میں یہ وہ مشکل ہے کہ جسے حل کرنے کے لئے اسلاف کے بہترین دماغوں نے ایک طویل عرصہ صرف کیا ہے۔ اور اس کا امکان نہیں ہے کہ اب ہم ان حدود سے آگے بڑھ سکیں۔ اب ہمارے پاس کوئی مزید نئی احادیث تو نہیں آ سکتیں' احادیث کا پورا ذخیرہ ان کے سامنے موجود تھا۔ آج ہم بیٹھ کر کوئی نیا "اسماء الرجال" بھی گھڑ نہیں سکتے' بلکہ اسلاف نے راویوں کے بارے

میں تحقیق و تفتیش کے بعد ان پر جو جرح و تعدیل کی اس پر آج ہمیں اعتماد کرنا ہو گا۔ ہمارا یہ علمی ورثہ جس کا اس قدر وسیع و عریض اثاثہ ہمارے پاس موجود ہے یہ سب بے بنیاد نہیں ہے' اس کی پشت پر کوئی خواہ مخواہ کی سوشلائی کا جذبہ یا شوق کارفرما نہیں تھا' یہ سب کچھ محض مشغلے کے طور پر نہیں کیا گیا' بلکہ یہ دین کی ایک اہم بنیادی اور واقعی ضرورت تھی جس کو ان ائمۂ دین نے پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ کو مجددین میں شمار کیا گیا ہے۔

اطاعت کی دو عملی صورتیں

رہا یہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اطاعت کا یہ نظام عملاً کیسے چلے گا' تو عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر تو اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اس کا والئ امر جسے آپ خلیفہ کہیں یا سلطان' اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس اطاعت کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اجتہادی رائے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے۔ اب یہ کون طے کرے گا کہ خلیفہ کی رائے درست ہے یا نہیں؟ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں اللہ' رسول' اور اولی الامر کی اطاعت کے حکم کے بعد اصولی طور پر تو یہ طے کر دیا گیا کہ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ "کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے مابین تنازعہ ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو" لیکن عملاً اس کا نظام کیا ہو گا؟ والئ امر اگر اپنی کسی رائے کے بارے میں کہہ رہا ہو کہ یہ چیز شریعت کے دائرے کے اندر ہے' لیکن کوئی صاحبِ علم یہ کہے کہ نہیں' اس سے شریعت کا فلاں حکم ٹوٹ رہا ہے تو اس کے فیصلے کے لئے کوئی ادارہ' کوئی ایجنسی موجود ہونا چاہئے۔ عصرِ حاضر میں خلافت کا نظام جب بھی قائم ہو گا اس میں اہم ترین مسئلہ یہی ہو گا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کون کرے؟ اول تو یہ کہ اولی الامر کیسے وجود میں آئیں؟ قرآن مجید نے ہمیں اس کا کوئی نظام نہیں دیا اور اس معاملے کو کھلا رکھا ہے' اس لئے کہ نزولِ قرآن کے وقت معاشرتی ارتقاء (Social Evolution) کا عمل بھی ابھی جاری تھا اور اس میں انسان کو ابھی درجہ بدرجہ ترقی کرنا تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ منقطع ہو چکا۔ اب کوئی والئ امر نبی نہیں ہو گا' لہٰذا معصوم نہیں ہو گا۔ ایک عام مسلمانوں میں سے ہو گا اور اس کا تقرر

"عن مشورة المسلمين" (مسلمانوں کے باہمی مشورے سے) عمل میں آئے گا۔ اس کے بعد اب یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر صاحبِ امر ایک بات کہے اور کچھ اہل علم یہ محسوس کریں کہ یہ از روئے قرآن و حدیث غلط ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ معاشرتی ارتقاء کا عمل آج جس مقام تک پہنچا ہے اس میں ریاست کے تین بنیادی اعضاء (Basic Organs) معین کئے گئے ہیں' یعنی مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور یہ فرضِ منصبی عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتوں (Higher Judiciary) کے ذمے عائد ہو گا کہ وہ اس معاملے کو طے کریں۔ خطا کا امکان اگرچہ وہاں بھی ہے' لیکن بہرحال صاحبِ امر (خلیفہ) اور دستور ساز اسمبلی' جسے مجلسِ ملی' مجلسِ شوریٰ' مجلسِ مقننہ' مجلسِ اجتہاد' کانگریس یا پارلیمنٹ' جو نام بھی دیا جائے' ان دونوں کے مابین بھی اگر نزاع پیدا ہو جائے تو اسے عدلیہ ہی کو طے کرنا ہو گا۔ اسی طرح قوم کا کوئی فرد اگر یہ سمجھتا ہے کہ مجلسِ ملی یا مجلسِ شوریٰ نے یہ جو فیصلہ کیا ہے یہ شریعت کے منافی ہے' یا وہ خلیفہ کے کسی فیصلے کے خلاف استغاثہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی عدلیہ ہی سے رجوع کرے گا۔

عملی اعتبار سے دوسری صورت یہ ہے کہ دین کا نظام ہی قائم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسے قائم کرنے کی جدوجہد اور محنت کرنا ہو گی' اس کے لئے جہاد کرنا ہو گا' اور اس جدوجہد کے لئے جماعت بنانا ہو گی۔ لیکن جماعت کا جو امیر ہو گا اس کی حیثیت اولی الامر کی ہو گی۔ اب اس صورت میں بھی جماعت کے اندر کوئی تنازعہ اٹھ سکتا ہے' کسی کو امیرِ جماعت کی کسی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہ اختلاف اگر اس درجے میں ہو کہ بس رائے کا اختلاف ہے تو بات اور ہے' اختلافِ رائے کے علی الرغم امیر کا حکم ماننا پڑے گا لیکن اختلاف کی نوعیت اگر یہ ہو کہ کوئی سمجھے کہ جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے وہ بات شریعت کی رُو سے جائز نہیں ہے' اس میں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو گیا ہے تو اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ آخری فیصلہ اس شخص کا اپنا ضمیر ہی کرے گا۔ یہاں کوئی عدالت فیصلہ نہیں کر سکتی' کیونکہ یہ ایک جماعتی معاملہ ہے۔ جماعت کی اپنی کوئی علاقائی حدود (Territorial Jurisdiction) نہیں ہیں' کسی علاقے پر اس کا حکم نہیں چل رہا ہے' چنانچہ اس کے اندر کسی عدلیہ کا معاملہ نہیں ہو گا' بلکہ اختلاف کرنے والے شخص کا اپنا فیصلہ

ہی حتمی ہوگا' جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتِی" کہ اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو' اگرچہ تمہیں مفتی فتویٰ دے بھی دیں۔ گویا اصل مفتی تمہارا قلب ہے۔ قلب کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر تمہارا ضمیر مطمئن ہے کہ تم نے اس وجہ سے امیر کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا یا جماعت ہی سے علیحدگی اختیار کر لی کہ تمہارے نزدیک صاحبِ امر (امیر) نے شریعت کی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اللہ کے ساتھ تمہارا معاملہ صاف رہے گا۔ اور اگر اصل سبب کچھ اور ہے' کوئی تکبر' حسد' طبیعت کا کوئی تلون' پاؤں کی بیڑی بن گیا ہے' یا راستے کی سختیاں ساتھ دینے میں آڑے آ رہی ہیں' آگے چلنے کی ہمت نہیں ہے اور صرف بہانہ بنایا جا رہا ہے تو یہ اللہ کے علم سے باہر نہیں' اس کے ہاں اس پر پکڑ ہوگی اور ہر انسان کو اس کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ لیکن دنیا میں ظاہر بات ہے کہ اس کا فیصلہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔ یہ بندے اور رب کے مابین راز رہے گا۔ یہ چند باتیں تھیں جو اس آیہ مبارکہ کے ذیل میں ہمارے سامنے آگئیں: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

دین میں "سمع وطاعت" کا مقام

اس ضمن میں اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۶ کا مطالعہ کرتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (التغابن: ۱۶)

"پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی امکانی حد تک' اور سنو اور اطاعت کرو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کے لئے۔ اور جو کوئی بچا دیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع کی کل پانچ آیات (۱۱ تا ۱۵) کے بارے میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ان میں ثمراتِ ایمانی کا بیان ہے' جن میں سے چار آیات کا تعلق گرد

نظر کی تبدیلی سے ہے' جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے' جس پر ہم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے زوردار دعوتِ عمل دی جا رہی ہے۔ صرف ایک لفظ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ" میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ دونوں کو سمو لیا گیا ہے اور اس کے بعد سارا زور دعوتِ عمل اور اس میں بھی خاص طور پر اطاعت پر ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں فرمایا گیا: "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" (سنو اور اطاعت کرو) اطاعت کے ضمن میں اگرچہ اس سے پہلے پوری ایک آیت گزر چکی ہے' جس پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں' لیکن اس آیۂ مبارکہ میں بھی "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" کے الفاظ میں اطاعت کی زوردار دعوت ہے۔ ان الفاظ کے حوالے سے چار باتیں ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں :

قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح

پہلی بات یہ کہ "سمع و طاعت" قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیت زیر درس کے علاوہ چار مقامات پر یہ جوڑا اسی طرح آیا ہے :

۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات کے بارے میں روایت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج میں عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرہ اگرچہ پوری کی پوری مدنی سورت ہے' لیکن اس کی آخری دو آیات اس اعتبار سے مکی شمار ہوں گی کہ واقعہ معراج مکی دور میں پیش آیا جس کے دوران انہیں عطیے کے طور پر یہ دو آیتیں دی گئیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۲۸۵) جس کا آغاز "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" کے الفاظ سے ہوتا ہے' کے آخری الفاظ ہیں :

> وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝
>
> "اور وہ کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور ہم نے تسلیم کیا' ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اے ہمارے رب' اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے"۔

سورۃ البقرہ کے بارے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ شریعتِ اسلامی کا نقطہ آغاز ہے۔

۲) شریعتِ اسلامی کا نقطۂ کمال یا نقطۂ عروج سورۃ المائدہ ہے۔ اس کی آیت ۷ میں فرمایا گیا:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

"اور یاد رکھنا اللہ کی نعمت کو جو (شریعت کے جامع ہونے سے) تم پر ہوئی ہے اور اس کا عہد (بھی یاد رکھو) جس میں اللہ نے تم کو پابند کیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔"

(۳) سورۃ النور کی آیت ۵۱ میں فرمایا گیا:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

"یقیناً ایمان والوں کی بات تو یہی ہے کہ جب ان کو بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے مابین تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔"

۴) اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں یہود کے طرزِ عمل کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ

"اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور سنیے اور ہم پر نظر کیجیے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور درست ہوتا۔"

تو یہ چار مقامات ہیں جہاں "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" کے الفاظ ایک جوڑے کی شکل میں آئے ہیں۔

اب ذرا اس کا منفی پہلو بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ کفار کی ایک روش تو یہ تھی کہ سننے ہی سے انکاری تھے، جیسا کہ سورۃ حم السجدہ کی آیت ۲۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝

"اور کافر (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ اس قرآن کو مت سنو اور (جب محمدؐ اسے پڑھ کر سنا رہے ہوں تو) اس میں شور و غل کرو' شاید کہ (اس تدبیر سے) تم غالب ہو جاؤ!"

اس صورت میں تو "سمع" ہی کی نفی ہو گئی' جبکہ ایک طرز عمل وہ تھا جو یہود نے اختیار کر رکھا تھا اور جس کا ذکر قرآن حکیم میں دوبار "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" کے الفاظ میں آیا ہے' یعنی "ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی"۔ یہود کے یہ الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۹۳ میں بھی نقل ہوئے ہیں اور سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں بھی۔ مؤخر الذکر آیت کا دوسرا ٹکڑا اوپر بیان ہوا ہے۔ آیت کے پہلے حصے میں یہود کا طرز عمل بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں کہ یہ کہتے ہیں "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھا "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا"۔ تو "سمع و طاعت" درحقیقت قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔

"سمع و طاعت" کا ایک اہم تقاضا--- فوری تعمیل

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اس اصطلاح اور اس اسلوب سے پیش نظر کیا ہے! "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" (سنو اور اطاعت کرو) کے الفاظ میں درحقیقت فوری (immediate) اطاعت کا حکم ہے' یعنی سنتے ہی اطاعت کا لازم ہو جانا۔ ایک درمیانی طرز عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات سن تو لی جائے' لیکن اگر اپنی سمجھ میں آئے تو مان لی جائے ورنہ رد کر دی جائے' اس طرح "سننے" اور "ماننے" کے درمیان "اپنی سمجھ" حائل ہو جاتی ہے۔ اس طرز عمل کا تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گویا آپ اس حکم کو نہیں مان رہے بلکہ اپنی سمجھ کی اطاعت کر رہے ہیں' کیونکہ آپ نے صرف اس حکم کو مانا ہے جو آپ کی سمجھ میں آگیا۔ گویا اصل مطاع تو آپ کی سمجھ ہوئی۔ یہ اسی طرح کا طرز عمل ہے جیسا یہ کہ اگر اللہ کا کوئی حکم آپ کے نفس کو بھی پسند آیا اور آپ اس پر عمل پیرا ہو گئے تو آپ نے اطاعت' اللہ کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی کی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تو بلا استثناء ہونی چاہئے' خواہ سمجھ میں آئے خواہ نہ آئے۔ تو "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" ایک ایسا اسلوب ہے جس میں فی الفور

اطاعت کا تقاضا ہے' یعنی سنتے ہی اس پر عمل کرو۔ اپنی سمجھ میں آنے یا نہ آنے کا سوال ہی درمیان سے نکل جانا چاہئے۔ میٹرک کے زمانے میں ہم نے ایک نظم

اور حملے کی صورت میں ان چھ سو سواروں کی ہلاکت یقینی تھی --- لیکن

Theirs not to make reply.
Theirs not to reason why.
Theirs but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت اس حکم کی حکمت دریافت کریں اور اپنے دلائل پیش کریں کہ یہ حکم غلط دیا گیا ہے' بلکہ آرمی ڈسپلن اس طرز عمل کا نام ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی فوری تعمیل کرو اور اس میں موت آتی ہے تو آئے! تو یہ ہے درحقیقت وہ طرز عمل کہ جو "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" کے جواب میں مطلوب ہے۔

سمع' طاعت پر مقدّم کیوں؟

اس سلسلے میں تیسری لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ "سمع و طاعت" میں "سمع" مقدم ہے "طاعت" پر۔ ویسے تو طبعی ضابطہ بھی یہی ہے کہ آپ کوئی بات سنیں گے تو اس کی اطاعت کریں گے' لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ "سمع و طاعت" کا حکم دیتے ہوئے "وَاسْمَعُوْا" کو کیوں نمایاں کیا گیا ہے؟ اس لئے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ایک اجتماعی شکل اور جماعتی ہیئت ہی میں ممکن ہے اور اس سلسلے کے تمام احکام سے بروقت آگاہی کے

لئے اس جماعتی نظم سے وابستگی اور پیوستگی ضروری ہے۔ اگر آپ اس جماعتی نظم سے وابستہ نہیں ہیں تو "سمع" ہی نہیں ہو گا' نتیجتاً "طاعت" کی نوبت کہاں آئے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام خطباتِ جمعہ میں صادر ہوتے تھے۔ اُس وقت آج کی طرح ریڈیو' ٹیلیویژن' اخبارات' ٹیلی فون اور ٹیلی گرام جیسے رَسل و رسائل اور ابلاغ کے ذرائع تو تھے نہیں۔ اب جو شخص جمعہ میں آتا ہی نہ ہو اور اس طرح ان احکام کے سننے ہی سے محروم رہے تو وہ اطاعت کیسے کرے گا! چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران منبر پر یہ فرمایا کہ یہ لوگ جو جمعہ میں شرکت سے رہ جاتے ہیں وہ اس طرز عمل سے باز آ جائیں' ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔ یعنی "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" کے الفاظ میں بد ترین کافروں کے لئے جو سزا سنائی گئی ہے انہیں وہ سزا ملے گی۔

اسی طریقے سے کوئی انقلابی جماعت جو اسی مقصد (غلبۂ دین) کے حصول کے لئے کوشاں ہے اگر آپ اس سے پیوست نہیں ہیں' اس سے چمٹے ہوئے نہیں ہیں' اس کے نظم کے ساتھ آپ کی وابستگی ہی نہیں ہے تو انقلابی جدوجہد سے متعلق احکام وہدایات آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ہرکارے اور پیادے احکام لئے لئے پھر رہے ہوں اور ایک ایک شخص کو تلاش کر کے ان کی تعمیل کرائیں۔ عدالتی نظام میں اور حکومتی سطح پر تو ایسا ہوتا ہے کہ گھروں پر جا کر سمن کی تعمیل کرائی جاتی ہے لیکن کسی انقلابی جماعتی نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے تو ع "پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ" کے مصداق جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے۔ ایک پتہ جب تک درخت پر لگا ہوا ہے اسی وقت تک وہ اس درخت کا حصہ ہے۔ درخت کی جڑ سے لے کر اس کی چوٹی کے پتوں تک کے مابین ایک رابطہ قائم ہے۔ جڑ کے ذریعے سے جو پانی اور غذا درخت حاصل کرتا ہے وہ اس کے آخری پتے تک بھی پہنچ جاتی ہے' لیکن جب کوئی پتہ درخت سے کٹ جاتا ہے تو اب درخت کی غذا سے اسے کوئی حصہ نہیں ملتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر جماعت سے آپ کا تعلق منقطع ہو گیا تو ظاہر بات ہے کہ اب آپ اس کے نظم اور سلک میں نہیں ہیں' بلکہ ایک ایسی پتنگ کی مانند ہیں جس کی ڈور کٹ چکی ہے اور ایک ایسے

پتے کی طرح ہیں جو اپنے درخت سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اسی کو پیوستگی کہا جاتا ہے اور اسی کے لئے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں منسلک ہونا' یعنی پرو دیا جانا۔ ہار میں اگر موتی پروئے گئے ہیں تو وہ ہار ہے' اور اگر اس کی ڈور ٹوٹ گئی ہے تو وہ ہار نہیں رہا بلکہ منتشر موتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کے افراد اگر اس کے ساتھ منسلک اور ملتزم ہیں تو وہ صحیح معنوں میں جماعت ہے۔ التزام کے معنی چمٹ جانا ہیں اور ملتزم وہ ہے جو جماعت کے ساتھ چمٹا رہے۔ یہی درحقیقت سمع کو مقدم رکھنے کا سبب ہے' ورنہ اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہ تھی' کیونکہ یہ بات تو بالکل ظاہر اور understood ہے کہ اطاعت کا مرحلہ آتا ہی سننے کے بعد ہے۔

سمع وطاعت کا لازمی تقاضا۔۔بیعت

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اس سمع و طاعت کو نبی اکرم ﷺ نے بیعت کی شکل دی ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ رسول تھے اور جو کوئی بھی آپ پر ایمان لے آتا اس پر' ایمان بالرسالت کے لازمی تقاضے کے طور پر' آپ کی اطاعت فرض تھی۔ اس کے باوجود نظمِ جماعت میں اس سمع و طاعت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے آپ نے صحابہ کرامؓ سے باقاعدہ بیعت لی۔ اس سلسلہ میں دو حدیثیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ عَنِ الحارثِ الاشعری رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : آمُرُکم بخمسٍ بالجماعۃِ' وَالسّمعِ' وَالطّاعۃِ' وَالھجرۃِ' وَالجھادِ فی سبیل اللّٰہ

(مشکوٰۃ المصابیح' بحوالہ مسند احمد و جامع الترمذی)

حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

"(مسلمانو) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں : جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم!"

اس حدیث میں حضور ﷺ نے سب سے پہلا حکم التزامِ جماعت کا دیا ہے۔ جماعتی نظم کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی اگر تو اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ سمع و طاعت کا تعلق ہو گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس نظامِ حکومت کو قائم کرنے

کی جدوجہد کے لئے جو جماعتی نظام قائم ہو گا اس کے امیر کے ساتھ وہی تعلقِ سمع و طاعت ہو گا۔ اس کے بعد دوسرا حکم سمع یعنی سننے کا اور تیسرا اطاعت کا دیا گیا۔ چوتھی اور پانچویں چیزیں ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ ہیں۔ ہجرت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا : اَیُّ الھِجرۃِ افضلُ یا رسولَ اللّٰہ؟ "اے اللہ کے رسولؐ، سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟" فرمایا : اَن تَھجُرَ مَا کَرِہَ ربُّکَ "کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے!" یہ ہے ہجرت--- اور نیت یہ رہے کہ اگر اللہ کے دین کا تقاضا ہو تو انسان اپنا گھربار، اہل و عیال اور مال و منال سب کچھ اس کی خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن پہلا قدم یہی ہے کہ جو چیز اللہ کو پسند نہیں ہے، جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو چھوڑ دیا جائے، اس سے ترکِ تعلق کر لیا جائے۔ اسی طرح "وَنخلَعُ وَنترُکُ مَن یفجرُکَ" کے مصداق ترکِ تعلق کی یہ قینچی علائقِ دنیوی میں بھی چل جانی چاہئے کہ فُسّاق و فجّار کے ساتھ آپ کی دوستی اور محبتِ قلبی کا تعلق منقطع ہو جائے--- اور جہاد فی سبیل اللہ اس کا مثبت پہلو ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں محنت، جدّوجہد، ایثار و قربانی، انفاق اور قتال، یہ سب جہاد فی سبیل اللہ ہی کے مدارج و مراتب ہیں۔ لیکن بہر حال نیت میں یہ چیز لازمی طور پر شامل رہنی چاہئے کہ وہ وقت آئے کہ میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جان کی بازی لگا دوں اور اس راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے سرخرو ہو جاؤں، میری گردن اللہ کی راہ میں کٹ جائے۔ اگر کسی کے دل میں یہ نیت بھی موجود نہیں تو حدیثِ نبویؐ کی رُو سے ایسا شخص حالتِ نفاق میں مرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں :

> مَن ماتَ وَلَمْ یَغزُ وَلم یُحدِّثْ بِہٖ نفسَہٗ، مات علٰی شعبۃٍ مِنَ النِّفاق (صحیح مسلم، عن ابی ہریرہؓ)
>
> "جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی دل میں اس کی آرزو رکھی تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر ہوئی"۔

ہمارے تصورِ دین کی کوتاہی

حضرت حارث اشعریؓ والی حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے اِس وقت کے تصورِ دین کا جائزہ لیجئے تو آپ کو بہت فرق و تفاوت نظر آئے گا۔ ہمارے تصورِ دین میں تو یہ چیزیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہمارے تصورِ دین میں وہ پانچ چیزیں تو ہیں جنہیں ایک دوسری حدیث میں ارکانِ اسلام فرمایا گیا ہے' یعنی کلمۂ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ---- لیکن ان پانچ چیزوں کا ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ اس حدیث کے الفاظ ہیں :

بُنِیَ الاسلامُ علٰی خمسٍ: شهادةِ ان لا اله الا اللّٰه وانَّ محمدًا رسولُ اللّٰه وَاِقام الصَّلٰوةِ وَایتاء الزَّکٰوةِ وحَجِّ البیتِ وصَومِ رمَضان (متفق علیہ' عن عبداللہ بن عمرؓ)

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے : گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ ارکانِ اسلام بیان فرمائے ہیں جو ہر مسلمان کو یاد ہیں لیکن دوسری پانچ چیزوں کا حکم بھی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے دیا ہے' تو ان سے بے اعتنائی چہ معنی دارد! بلکہ ایک روایت میں الفاظ ہیں :

اِنّی آمرُکم بخمسٍ' اللّٰهُ امرَنی بهنّ ....

"میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے..."

"اَطِیعُوا اللّٰهَ وَاَطِیعُوا الرَّسُول" کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو بھی لازم سمجھا جائے۔

صحابۂ کرامؓ کی بیعت کے الفاظ اور ان کی تشریح

اس "سمع و طاعت" کے لئے رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت کی وہ اس حدیث میں مذکور ہے :

عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰه عنه قال : بَایَعنا رسولَ

اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم علی السّمعِ وَالطّاعۃِ فِی
العُسرِ وَالیُسرِ وَالمَنشطِ وَالمَکرہِ وعلٰی اثرۃٍ عَلینا
وعلٰی ان لا نُنازِعَ الامرَاَھلَہٗ'

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے"۔۔۔۔ بَاعَ - یَبِیعُ بیچنے کو کہا جاتا ہے اور بیعت' اہل ایمان کی اللہ کے ساتھ بیع و شراء ہے' جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا گیا: "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ" (اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔) لیکن چونکہ اللہ سامنے نہیں ہے لہٰذا یہ بیع و شراء اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔ اور عرب کا دستور یہ تھا کہ کوئی سودا جب مکمل ہو جاتا تھا تو مصافحہ (Hand Shake) کیا جاتا تھا۔ اور یہ مصافحہ بیعت میں بھی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ ﷺ سے یہ بیعت کس چیز کی تھی؟ اس کے لئے الفاظ آئے ہیں: عَلَی السَّمعِ وَالطَّاعَۃِ "اس پر کہ سنیں گے اور مانیں گے!" یہی دراصل وہ جوڑا ہے (سمع وطاعت) جس کے حوالے سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اور جس کا حکم آیۂ زیر درس میں ہے: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا۔

اب حدیث میں اس سمع و طاعت کی تین کیفیات بیان ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ "فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ" یعنی "چاہے تنگی ہو یا آسانی ہو"۔۔۔۔ یہ نہیں کہ بس آسانی ہی کے اندر اطاعت کریں گے۔ بلکہ چاہے تنگی ہو' مشکل ہو' ہمارے لئے اپنا گزر مشکل ہوا ہو' لیکن بہرحال جب نبی ﷺ کا حکم آئے گا تو بلا چون و چرا مانیں گے۔ دوم یہ کہ "وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ" یعنی "چاہے ہماری طبیعت میں آمادگی ہو' نشاط ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں کو مجبور کرنا پڑے"۔۔۔ اطاعت کی بحث میں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اطاعت اصلاً تو طوعِ خاطر سے اور بطیبِ خاطر ہی مطلوب ہے' لیکن جماعتی زندگی میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ "Someone has blundered" آپ کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ میرا امیر غلطی کر رہا

ہے، لیکن اگر وہ معصیت کا حکم نہیں دے رہا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی صریح حکم کے خلاف حکم نہیں دے رہا' تو اگرچہ یہ حکم آپ کی رائے کے خلاف ہو لیکن آپ کو ماننا ہو گا۔ اس میں ظاہر ہے کہ آپ کو اپنی رائے کو دبانا ہو گا' اپنے نفس کو گھونٹنا ہو گا' لیکن اطاعت بہرحال لازم ہو گی۔ سوم یہ کہ "وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا" یعنی "اور چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے"۔ جماعتی نظام میں یہ مرحلہ لازماً آجاتا ہے۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے' جو وسوسہ بھی ہو سکتا ہے اور کسی کی واقعی رائے بھی ہو سکتی ہے' کہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہوں' میرے اندر اس کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری Standing بہت ہے' میں بہت عرصے سے جماعت کے اندر ہوں' لیکن ایک شخص جو بالکل نووارد تھا اسے امیر بنا دیا گیا ہے۔ ایسے معاملات رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بھی پیش آئے ہیں۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب حضورؐ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا تو کئی لوگوں نے اعتراضات کئے اور کہا گیا کہ جعفر طیارؓ جیسے لوگ ایک آزاد کردہ غلام کی کمان میں دیئے جا رہے ہیں۔ حضرت جعفرؓ واقعتاً بڑے جلیل القدر صحابی تھے' حضورؐ کے چچازاد بھائی اور حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے۔ پھر حضورؐ نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو امیر بنایا تو اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ اور اپنے مرضِ وفات کے اندر آپؐ نے بڑے غصے سے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے کہ اگر آج تم لوگ اسامہ کی امارت پر اعتراض کر رہے ہو تو تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔

انسانی معاملات میں یہ ساری چیزیں پیش آسکتی ہیں' پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حضورؐ نے جب بیعت لی تو "وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا" کے الفاظ سے اہلِ بیعت کو گویا کہ باندھ لیا' کیونکہ یہ فیصلہ اور اختیار صاحبِ امر کا ہوتا ہے کہ وہ کس کے حوالے کوئی ذمہ داری کرتا ہے۔ چنانچہ بیعت میں یہ شرط بھی شامل ہو گئی کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے ہم اطاعت کریں گے۔

اب جماعتی نظام میں ماتحت امراء کا ایک نظام ناگزیر ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ماتحت امراء تھے۔ آپؐ کوئی جیش بھیجتے تو اس کا کسی کو سپہ سالار مقرر فرماتے۔ پھر کسی ایک ہی لشکر میں مختلف دستوں کے مختلف امراء ہوتے تھے: میمنہ کا امیر کوئی اور' میسرہ کا کوئی اور' قلب پہ کوئی اور' اور ہراول دستے کا کوئی اور ہوتا۔ غزوۂ احد میں درے پر جو پچاس تیر انداز مقرر کئے گئے ان پر بھی ایک امیر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ یہ بیعت بھی لی گئی کہ "وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ" یعنی جو بھی صاحبِ امر ہوں گے' ماتحت امراء ہوں گے' ان سے ہم امر کے معاملے میں جھگڑیں گے نہیں' وہ جو حکم دیں گے اسے بھی مانیں گے۔ اس میں وہ استثناء بہرحال موجود رہے گا کہ وہ معصیت کا حکم نہیں دے سکتے۔ اس بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ ماتحت امراء کا معاملہ' چاہے وہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھا' اور حضورؐ کے انتقال کے بعد چاہے مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو اور چاہے کسی جماعت کا امیر ہو' سب کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہو گی اور یہ اس سے باہر نہیں جا سکتے' اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتے۔

اس حدیث میں آگے الفاظ آئے ہیں: "اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْهَانٌ"۔ یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت میں نہیں ہیں' صرف صحیح مسلم کی روایت میں ہیں۔ پھر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ یہاں صیغہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے تک کے الفاظ بیعت کرنے والوں کی طرف سے جمع متکلم کے صیغہ میں ہیں' لیکن اس ٹکڑے میں جمع مخاطب کا صیغہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان الفاظ کا اضافہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِلَّا اَنْ تَرَوْا كفرًا بَوَاحًا عند كم فيه مِن اللّٰه برهانٌ "سوائے اس کے کہ تم دیکھو کوئی کھلا کفر جس کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل موجود ہو"۔ یعنی تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ یہ بات کتاب و سنت کے منافی ہے' یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے' یہ کفر ہے' اس لئے میں نہیں مانوں گا جیسے کہ وہ معاملہ ہوا کہ امیر نے خود کشی کا حکم دیا کہ آگ کے گڑھے میں کود جاؤ' لیکن مامورین نے اسے ماننے سے انکار کر دیا

اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر کہیں وہ اس آگ میں کود گئے ہوتے تو کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

اس بیعت میں آخری بات یہ ہے کہ "وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا" یعنی "اور یہ کہ ہم حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے"۔ حق بات کہنا اور صحیح مشورہ دینا اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ کسی بھی ہیئت اجتماعی میں اس کا ایک نظام موجود ہونا ناگزیر ہے اور اس کے بغیر کوئی جماعتی زندگی صحیح اور صالح نہیں رہ سکتی۔ امیر کا انداز تحکمانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے باہمی مشورے سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ چنانچہ بیعت کی بنیاد پر بننے والی تنظیم میں بھی مشورہ کا نظام لازمی ہے۔ "لَا یَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ" یعنی "ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔ کوئی شخص یہ سمجھتے ہوئے کہ میری حیثیت ہی کیا ہے اور میں کچھ کہوں گا تو لوگ اس پر ہنس پڑیں گے، خاموش رہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اسے کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ اس کی جو رائے ہے وہ دیانتداری کے ساتھ پیش کر دینی چاہئے۔ البتہ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کے نظم جماعت میں فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں ہوتا۔ ع "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید" یعنی دو سو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسان کا ذہن وجود میں نہیں آتا! اقبال نے اس شعر میں بڑی سیدھی سی بات بیان کر دی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ ہے ع "گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو!" یعنی یہ جو مغرب کا تصورِ جمہوریت ہے کہ ووٹوں کی گنتی سے معاملات طے کئے جائیں اس سے بچو! اسلامی نظم جماعت میں باہمی مشورے کے بعد فیصلے کا اختیار صاحب امر کو حاصل ہوتا ہے۔

بیعت کا موقع و محل

اس بیعتِ سمع و طاعت کے بارے میں ایک اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بیعت مکہ میں نہیں لی۔ یہ بیعت اگرچہ مکی دور میں ہی ہوئی ہے، لیکن سمجھ لیجئے کہ یہ کس مرحلے پر ہوئی ہے۔ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے

والے تعداد میں بہت کم تھے۔ پھر چونکہ سب مسلمان ایک ہی شہر میں تھے لہٰذا سب کا واسطہ و تعلق حضورؐ کے ساتھ براہ راست تھا۔ آپؐ کا ہر حکم ہر ایک کو براہِ راست پہنچتا تھا' یا زیادہ سے زیادہ کسی پیغام رساں کی ضرورت ہوتی تھی۔ حضرت خبابؓ بن ارت اور عمار بن یاسرؓ جیسے حضرات دارِ ارقمؓ میں حضورؐ کے پاس ہمہ وقت موجود رہتے تھے اور جونہی کوئی وحی نازل ہوتی یہ مکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں میں پہنچ کر تازہ نازل ہونے والی قرآنی آیات کی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ اور کسی درمیانی نظم کی ضرورت نہیں تھی' لہٰذا کوئی ماتحت امراء نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں ایمان لانے والے صحابہ سے بیعت نہیں لی۔ لیکن جب یثرب سے لوگ آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے لگے اور ایک سال میں چھ افراد ایمان لائے' دوسرے سال وہ بارہ ہو گئے اور تیسرے سال میں جب بہتر (۷۲) افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تب آپؐ نے ان سے مذکورہ بالا الفاظ میں بیعت لی اور ان میں سے بارہ کو ان پر نقیب مقرر کر دیا۔ ہم نے تنظیم اسلامی کے ماتحت نظم میں "نقیب" کا لفظ وہیں سے لیا ہے۔ نیز قرآن مجید میں بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں پر بارہ نقباء مقرر تھے' یعنی ہر قبیلے پر ایک نقیب تھا۔ نقیب کے معنی ہیں خبر گیری کرنے والا' دیکھ بھال کرنے والا' نگرانی کرنے والا۔ تو حضورؐ نے بہتر میں سے بارہ افراد کو نقیب مقرر کر دیا' گویا ہر نقیب کے حوالے پانچ پانچ مسلمانوں کو کر دیا کہ وہ ان کے حالات کی خبر گیری کرے' ان کی نگرانی اور رہنمائی کرے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان بہتر افراد کا حضورؐ سے براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ تو اگلے سال حج ہی کے موقع پر آئیں گے تو ملاقات ہو گی۔ تو گویا کہ درحقیقت یہ بیعت ایک ایسے نظمِ جماعت میں لی گئی جس میں کچھ درمیانی امراء اور عہدیدار بھی ہوں اور ہر صاحبِ ایمان کا براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی حدیث کو تنظیم اسلامی کے لئے بیعت کی بنیاد بنایا ہے۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ نظمِ جماعت کے لئے صرف اس ایک حدیث کے اندر مکمل دستور موجود ہے۔ ہم نے اگرچہ تشریح و توضیح کے لئے اس کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی بنایا ہے' اس کے قواعد و ضوابط بھی طے کئے ہیں اور نظام العمل بھی ترتیب دیا ہے' لیکن اس سب کا دارو مدار درحقیقت اسی پر ہے۔ اسی حدیث سے استنباط اور استدلال کرتے ہوئے ہم نے اپنا

جماعتی نظام تشکیل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" اور "آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" اور پھر اس سمع و طاعت کے لئے یہ مسنون بیعتِ سمع و طاعت' جو متفق علیہ احادیث سے ثابت ہے' ہم ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ آمین!!

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْآیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ OO